اداریہ

قضیہ فلسطین اور موروثیت

پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد

فلسطین جسے تاریخی طور پر شام کہا جاتا تھا انسانی تہذیبوں میں اپنی سیاسی، معاشی، مذہبی اور ثقافتی وجوہات کی بناء پر صیہونی غیر قانونی تسلط سے قبل بھی اپنا الگ مقام رکھتا تھا اور اسے یہودی اور عیسائی روایات میں بھی تقدس حاصل تھا۔ قرآن کریم نے اسی علاقے کے حوالے سے سورہ بنی اسرائیل یا اسراء کے آغاز میں یوں ارشاد کیا ہے ''پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے دور کی اس مسجد تک جس کے ماحول کو اس نے برکت دی ہے تا کہ وہ اسے اپنی کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کرائے'' (۱:۱۷)۔ تفصیلات میں جائے بغیر اس آیت مبارکہ میں پہلی بات یہ واضح کر دی گئی ہے کہ الصخرہ کے اردگرد کا ماحول خصوصیت رکھتا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ نے برکت سے نوازا ہے۔ یہی سبب ہے کہ الاقصیٰ یا دُور والی مسجد کو القدس نہ صرف عربی بلکہ عبرانی زبان میں بھی کہا گیا ہے۔

دوسری بات یہ سمجھائی گئی ہے کہ اس میں اہل دانش کے لیے نشانیاں ہیں یعنی قوموں کے عروج و زوال کی داستان کے بعض اہم ابواب کا تعلق اس خطہ کے ساتھ ہے۔ یہاں قرآن کریم نے یہودی اساتیر کے اس نقطہ نظر سے مکمل طور پر اختلاف کیا ہے جس میں یہودیوں کے ''منتخب قوم'' ہونے کی بناء پر گویا انہیں القدس وراثت میں اس طرح دے دیا گیا ہے کہ اس کی تولیت نسلاً بعد نسل صرف یہودی تخم رکھنے والی نسل ہی میں رہے۔ قرآن کریم زمین اور حیات بعد الممات میں انسانوں کو شرف دینے کا سبب نہ ان کی نسلی، لسانی، قبائلی یا خطے سے وابستہ عصبیت کو قرار دیتا ہے اور نہ ایسی کسی وراثت کا قائل ہے جو ازل تا ابد کسی ایک گروہ کے سپرد کر دی جائے۔

قرآنی اخلاقیات میں ان تعصبات کی جگہ تقویٰ، بندگیٔ رب اور حاکمیت الٰہی کے قیام کو معیار

قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ جب تک ایک گروہ انسانیت اس اخلاقی ضابطے پر عمل کرتا ہے زمین پر اختیار کا مستحق قرار پاتا ہے ورنہ اس سے بہتر گروہ کے ذریعہ ایک تاریخی عمل کے طور پر تبدیلی لائی جاتی ہے۔ ''یہ تو زمانے کے نشیب و فراز ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں'' (آل عمران ۳: ۱۴۰)۔ قوموں کے عروج و زوال کے قرآنی نظام میں للہیت اور عدل کو بنیاد قرار دے کر یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ جو قوم بھی اپنا تعلق رب سے جوڑنے کی بجائے جاہلانہ عصبیت و عربیت یا صیہونیت سے جوڑے گی اور بندگیٔ رب کو نظر انداز کرتے ہوئے جادۂ عدل سے انحراف کرے گی وہ قیادت کی مستحق نہیں ہو سکتی۔

لیکن کیا اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ اگر حقیقت واقعہ کے طور پر ایک سفاک طاغوتی قوت کسی خطہ پر قابض ہے اور اس کے افراد کو محکوم، مظلوم اور مستضعفین بنا کر ظلم کا نشانہ بنا رہی ہے تو اسے یہ اختیار دے دیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ طاغوت کے مسلط ہونے میں حمایت ربانی شامل ہے؟ بات بہت واضح ہے کہ جو عدل، رحم و کرم، اور شفقت کا منبع ہے جو اپنے بندوں سے ہر لحہ محبت کرتا ہے وہ طاغوت اور ظلم کی نہ تو پشت پناہی کر سکتا ہے نہ اسے ظلم کرتے ہوئے دیکھ کر خوش ہو سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے ایسے مجبور و بے کس افراد کے حوالے سے یوں ہدایت کی ہے ''آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لیے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ ہمارے رب ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں، اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کر دے'' (النساء ۴: ۷۵)۔ گویا ظلم جہاں بھی ہو اور جس کسی کو اس کے اپنے گھر میں مجبور و بے کس بنا دیا گیا ہو قرآنی اخلاقیات کا مطالبہ ہے کہ اسے طاغوت سے نجات دلانے میں مدد کی جائے اور حقوق انسانی کی بحالی کے لیے جہاد کو اختیار کیا جائے۔

اس تناظر میں دیکھا جائے تو صیہونی قابضوں کا یہ دعویٰ کہ ان کا فلسطین پر کوئی آبائی حق ہے، نہ قرآن کی روشنی میں اور نہ خود ان کے مصادر کی بنیاد پر کوئی سنجیدہ دعویٰ خیال کیا جا سکتا ہے۔ اس حوالے سے ریچل ہیسی نائے کا مقالہ Historiography in Relations to the Territory of Palestine

قیمتی معلومات فراہم کرتا ہے اور بیک وقت لادینی ذہنیت رکھنے والے مفکرین اور دیگر حضرات کے تصورات کا خلاصہ پیش کرتا ہے۔ اس نوعیت کی علمی بحث سے قطع نظر فلسطین کے مسلم اور عیسائی باشندوں پر صیہونی مظالم بیسویں صدی کی تاریخ کے تاریک ترین باب سے تعلق رکھتے ہیں اور صرف سماعت، بینائی، اور قوتِ عقل سے محروم شخص ہی فلسطینیوں کے حق خود ارادیت کا انکار کر سکتا ہے۔

اس پورے قضیے میں مغربی طاقتوں کا گھناؤنا کردار بھی ایک شفاف تاریخی حقیقت ہے۔ برطانیہ ہو یا امریکہ ناموں کے فرق کے باوجود دونوں قوتوں نے اپنے مقدور بھر ظلم کا ساتھ دینے اور مظلوم فلسطینیوں کو عدل سے محروم رکھنے میں ایک سفاکانہ رویہ اختیار کیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ فلسطینیوں پر اس ظلم کے ذمہ دار صرف بیرونی دوست نما دشمن ہیں بلکہ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ خود فلسطینیوں کے بعض دھڑے اور نام نہاد عرب قومیت کے علمبردار ممالک نے زبانی جمع خرچ کے سوا آج تک کوئی ایسا اقدام نہیں کیا جو ان کی سنجیدگی کا پتہ دیتا ہو۔ اگر پوری صورت حال کو اختصار کے ساتھ بیان کیا جائے تو تین عوامل بہت نمایاں طور پر کارفرما نظر آتے ہیں۔ اولاً مغرب کے علمی اور ابلاغی حلقوں کی طرف سے ایک سوچی سمجھی حکمت عملی کے طور پر عالمی افق پر معلومات کا اس طرح نشر کرنا کہ فلسطینی ظالم، قاتل، دہشت گرد، خودکش حملہ آور اور بنیاد پرست اور سیامیت کش (anti-semlt) نظر آئیں اور ارض مقدس پر ناجائز قبضہ کرنے والے، نسل پرست، خون آلود ہاتھوں والے اسرائیلی اس ظلم کا نشانہ سمجھے جائیں۔ معروف ماہر لسانیات ایڈورڈ سعید کی تصنیفات اس حوالہ سے انتہائی مستند حقائق فراہم کرتی ہیں۔

ثانیاً خود فلسطینیوں کو اس ابلاغی سازش کے نتیجہ میں نفسیاتی اور ذہنی طور پر دو بیماریوں میں مبتلا کر دیا جائے یعنی اوّل یہ کہ وہ ایک کمزور، بے بس، پسماندہ لوگ ہیں جنہیں اگر کوئی خیرات دے دی جائے تو انہیں شکرگزار ہونا چاہیے گو وہ اس خیرات کے بھی مستحق نہیں ہیں۔ چنانچہ وہ صیہونیوں کی شرائط پر جن کی حمایت برطانیہ اور امریکہ روز اول سے کرتا آ رہا ہے احسان مندی کے ساتھ عمل کرنے کے لیے آمادہ ہوں اور روٹی کے جو بھی ٹکڑے اُنہیں دے دیے جائیں، اس پر شاکر و شاداں ہونے

کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو جائیں۔ دوم یہ کہ یہ تصور نہ صرف فلسطین کے مظلوم باشندوں بلکہ نام نہاد عرب قومیت کے علمبردار ممالک کے فرمانرواؤں کے بھی ذہن نشین کرا دیا جائے کہ مسئلہ کا حل صرف گفتگو سے ہی ہوسکتا ہے۔ قوت کا استعمال کوئی کام نہیں کرے گا۔ یہ نصیحت اور تصور ان اقوام کی طرف سے گزشتہ ۶۰ سال سے پیش کیا جا رہا ہے جو موجودہ دور کی تاریخ میں سب سے زیادہ قوت کے اندھے استعمال پر عمل کر کے کروڑوں افراد کے سفاکانہ قتل کی ذمہ دار ہیں۔ اور صرف یہ جانتی ہیں کہ لاٹھی کے بغیر بھینس پر قبضہ نہیں ہوسکتا۔

بہرصورت اس بات میں لازماً صداقت پائی جاتی ہے کہ بعض قضیے گفتگو سے بھی طے ہوسکتے ہیں یہ اسی وقت ہوگا جب دوسرے فریق کو قرآن کریم کی الہامی حکمت کی روشنی میں، یہ احساس ہو جائے کہ اس کا مقابلہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کے ساتھ ہے، ایک ایسی قوم کے ساتھ ہے جس کی نگاہ میں موت کا خوف کوئی مقام نہیں رکھتا اور جو شہادت اور جہاد کو اپنا مقصد حیات سمجھتی ہے۔

اس کے برعکس اگر فریق مخالف کو یہ معلوم ہو کہ نام نہاد مسلم فرمانروا ہر اس بات کو لپک لپک کر خوش آمدید کہنے کے لیے بے تاب ہیں جو امریکہ کی طرف سے بطور ایک اشارہ کے بھی آ جائے تو مذاکرات اپنا مفہوم کھو بیٹھتے ہیں۔ گویا کمزوری، لاچاری، بے بسی اور افلاس کے احساس کو روح اور دماغ میں اتنا جاگزیں کر دیا جائے کہ اسرائیلی وکیل جو کچھ کہے اسے فوراً شکر گزاری کے احساس کے ساتھ مان لیا جائے۔ یہ ایک مسلسل نفسیاتی جنگ ہے جو ۶۰ سال سے لڑی جا رہی ہے اور جس کے نتیجہ میں بعض نام نہاد قائدین آخر کار امریکہ کی ہر تجویز کو ماننے پر آمادہ ہوتے چلے گئے ہیں۔

ثالثاً اس مغربی اور صیہونی حکمت عملی کا ایک اہم جزو آبادی کے اس تناسب کو جو ۱۹۴۸ء سے ایک تاریخی حقیقت کی حیثیت رکھتا تھا اور جس میں مسلمان اور عیسائی فلسطینی اکثریت میں اور صیہونی اقلیت میں تھے اس طرح تبدیل کیا جائے کہ اگر فلسطینیوں کو کچھ ٹوٹے پھوٹے حقوق بطور خیرات دینے بھی پڑیں تو وہ ظالم اور قابض صیہونیوں کے لیے کبھی خطرہ نہ بن سکیں۔

اللہ تعالیٰ کا نظام بھی عجب ہے اس پورے عرصہ میں صیہونیوں نے چھانٹ چھانٹ کر فلسطینی

نوجوانوں کو تشدد اور قتل کا نشانہ بنایا ہے لیکن فلسطین میں آبادی میں نہ صرف نمایاں اضافہ ہوا بلکہ لڑکیوں کے مقابلہ میں لڑکوں کی پیدائش کی شرح زیادہ رہی۔ گویا جہاد کے لیے انسانی وسائل کی فراہمی میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ اس حقیقت کو سمجھتے ہوئے مغرب نے جو حکمت عملی نہ صرف ارض مقدس میں بلکہ پورے عالم اسلام میں مسلم دانش وروں کے تعاون سے اختیار کی ہے وہ آبادی پر قابو پاتے ہوئے ترقی کی شرح کو کم سے کم رکھنے کی پالیسی ہے۔ مقام حیرت ہے کہ ایران جیسے ملک نے بھی اپنی شرح پیدائش کو قابو میں کرنے کی اعلیٰ مثال پیش کی ہے اور کل تک جہاں شرح پیدائش ۵ فیصد ہوا کرتی تھی اب ۲ فیصد پر آ گئی ہے۔

مغربی تصور ترقی کا ایک لازمی جزو آبادی پر قابو کا فلسفہ ہے جس کے نتیجے میں یورپ امریکہ اور چین معمر افراد کی کثرت اور نوجوانوں کی قلت کا شکار ہو رہے ہیں۔ لیکن بجائے اس مسئلہ کے فطری حل کی طرف جانے کے مغرب کی حکمت عملی یہ ہے کہ آبادی کے فطری دباؤ کو جو زیادہ آبادی کے خطوں سے کم آبادی کے خطوں کی طرف ہو رہا ہے روکنے کے لیے بجائے اپنے گھر کو درست کرنے کے زیادہ آبادی کی شرح والے ممالک کو اپنی پیدائش میں کمی پر امداد کی رقوم دے کر آمادہ کیا جائے تاکہ آبادی کا بہاؤ ان کی طرف نہ ہو اور اس طرح وہ اپنے اقتدار کو زیادہ محفوظ و مستحکم کر سکیں۔

اگر آبادی کے حوالے سے یہ سازش کامیاب ہوتی ہے تو آئندہ ۳۰ سالوں میں مسلم فلسطین کی جگہ جزوی اکثریت والا خطہ وجود میں آ جائے گا اور فلسطینی جو اقلیت نہ ہونے کے باوجود ظلم اور عصبیت کا شکار ہیں ایک اقلیت بن جانے کے بعد اپنے حقوق کی طرف تصور میں بھی دیکھنے کے قابل نہیں رہیں گے۔

مسلم دانش وروں کا فرض ہے کہ وہ عالمی طاقتوں کی حکمت عملی اور منصوبہ بندی سے شعوری آگاہی کے ساتھ خود اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے متبادل حکمت عملی تجویز کریں اور مسلم دنیا کے مغرب زدہ فرمان رواؤں کو بار بار مستقبل کے خطرات اور مسائل سے متعارف کراتے ہوئے ان مسائل کے حل بالخصوص اپنی سیاسی حاکمیت کو مضبوط کرنے، مغرب کی ذہنی، مادی اور روحانی غلامی

سے نجات حاصل کرنے اور دفاع اور معیشت میں بھی خودانحصاری کے حصول کی طرف متوجہ کریں۔

ایک طاقتور مسلم دنیا ہی مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کرسکتی ہے۔ جب تک مسلم دنیا کاسہ گدائی ہاتھ میں لیے اپنے دفاع، اپنی سیاسی آزادی، اپنے تعلیمی نظام، اپنے قانون حتیٰ کہ اپنی زبان وثقافت کے لیے بھی مغربی سامراج کی مرہون منت ہوگی دستوری طور پر آزاد ہونے کے باوجود ایسے ممالک اپنے مفادات کا تحفظ نہیں کرسکیں گے۔

فلسطین کی آزادی اور وہاں پر اسلامی معاشرے کے ساتھ اسلامی سیاسی حاکمیت کا قیام نہ صرف فلسطینیوں کے دل ودماغ کا مطالبہ ہے بلکہ ایک عالمی انسانی ضرورت ہے۔ اگر امن عالم ایک ضرورت ہے تو اس کا وجود اسی وقت ہوگا جب فلسطین، کشمیر، میانمر اور دیگر مقامات کی تحریکات حریت کو تقویت پہنچا کر کامیاب کیا جائے تاکہ وہ نزاعات، ظلم اور زیادتیاں ختم ہوں جو آخر کار سیاسی، معاشی اور اخلاقی مسائل کا اصل سبب قرار پاتی ہیں۔ یہ ایک عالمی مسئلہ ہے اور اسے صرف فلسطینی عوام کے آزادانہ حق خودارادیت کی بنیاد پر ہی حل کیا جاسکتا ہے۔ یہی صورت حال مقبوضہ کشمیر کی ہے خطے کا امن وسکون اس بات سے وابستہ ہے کہ مقبوضہ کشمیر میں ریاستی دہشت گردی ختم ہو اور اہل کشمیر کو آزادانہ طور پر انتخابات کے ذریعہ اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے۔

گویا محض مذاکرات مسئلہ کا حل نہیں ہوسکتے مظلوم افراد کو حق خودارادیت دینے اور ان کی آزاد ریاست کے قیام کے بغیر مسئلے کا حل ممکن نہیں۔

☆☆☆☆